

جوڑتے ہیں؟ اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟“

داوچی نے مسکرا کر کہا۔ ”جو طولیے کے ایک خر کو ایسا بادے کے لوگ کہیں

یہ مشی چنت رام ہے۔ یہ مشی جی ہیں، وہ میجانہ ہو وہ آفانہ ہو تو پھر کیا ہو؟“

میں چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤچی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی اپنے پاؤں کی طرف دیکھتے تھے اور پندلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے و قفوں بعد ذرا سا ہنسنے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ کہنے لگے ”میں کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک انھا کر فرمایا، چوپال زادے ہمارے پاس آؤ۔ میں لاٹھی شیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جھٹتہ پٹھاڑ اور دیگر دیہات کے لڑ کے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے میٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اور انھانے کی ہمت نہ تھی۔ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں۔ انہیں چرنے چلنے کے لیے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو۔ پھر حضور نے میری عرض نے بغیر پوچھا، کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چنتو۔ حضرت مسکرانے۔ تھوڑا ہنسنے بھی۔ فرمانے لگے، پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چنت رام ہو گا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چڑا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا۔ پائچامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر نسرخ رنگ کا جانیگہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری۔“

میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ ”آپ بکریاں چراتے تھے داؤچی؟“

”ہاں ہاں۔“ فخر سے بولے۔ ”میں گذریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔“

حیرانی سے میرا منہ ٹھلا کا ٹھلا رہ گیا اور میں نے معاملے کی تہہ تک پہنچنے کے لیے جلدی سے پوچھا۔ ”اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے؟“

داوچی نے کرسی چارپائی کے قریب کھنچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے۔ ”جان پدر! اس زمانے میں توشہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے۔ میں گاؤں کی

بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ اردو گرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرفاً پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے۔ ان کا سارا خاندان زیور علم سے آراستہ تھا اور دینی فعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جڈا مجدد مہاراجہ شمسیر کے میر غشی۔ گھر میں علم کے دریافت ہوتے تھے۔ فارسی عربی، جبر و مقابلہ، اقلیدس حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لوندیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا لیکن آپ کی زبانی ان کی تجھر علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہ اور حکیم مومن خان مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم وی میں مفتی آزر زادہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی۔

مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ذرخا اس لیے میں نے جلدی سے

پوچھا۔ ”پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔“

”ہاں۔“ داؤ جی اپنے آپ سے باقیں کرنے لگے۔ ”ان کی باقیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ میں تو اسی وقت لاٹھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بوریے پر بیٹھو۔ میں نے کہا، جی انھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گز گئے، اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے۔ اپنے چوبی صندوق پر سے حروفِ ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف، بے، پے، تے۔ سجان اللہ کیا آواز تھی، کس شفقت سے بولے تھے، کس لہجہ سے فرمائے تھے۔ الف، بے، پے، تے“ اور داؤ جی ان حروف کا اور دکرتے ہوئے اپنے مااضی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دیاں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اوہ رہنٹ تھا اور اس کے ساتھ مجھیلوں کا حوض۔ پھر انہوں نے بیاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا۔ ”اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے۔ دونوں کے درمیان حضور کا یا غچہ تھا اور سامنے ان کی قدمی عظیم اشنان حوالی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ در فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی۔“

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد بالا دب بالا لاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا۔ ”حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟“ تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور

پھر بولے۔ ”حضرت امام اعیل چشتی رحمۃ اللہ علیہ۔ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جانِ جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔ کبھی جانِ جاناں کی رعایت سے مظہر جانِ جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔“

میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا بھی اور خواہش مند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے۔ ”سب سڈی ایری سُم کیا تھا؟“ ان انگریزوں کا بڑا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ و کثوریہ کا فرمان لے کر، سارے معاملے میں گھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سُم کا سارا اڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میز سے گرامر اٹھائی اور بولے۔ ”بابر جا کر دیکھ کے آکہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا کہ نہیں۔“ میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔

داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا۔ جب وہ دیکھتے کہ گھر مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے۔ ”سب ایک ایک شعر سناؤ۔“ پہلے مجھی سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا ہے

لازم تھا کہ دیکھو مرارستہ کوئی دن اور

تھا گئے کیوں اب رہو تھا کوئی دن اور

اس پر وہ بتائی بجاتے اور کہتے۔ ”اویں شعر نہ سنوں گا، اردو کم سنوں گا اور

مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔“ میں کہتا۔ ”مجھے سوچنے دیجئے، اتنے میں بی بی سنائے۔“

لبی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپورِ دم در کشید

چو خرسو برا شس قلم در کشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر پکارتے۔

لبی بی پیچی رکھ کر کہتی۔

”شورے شد داز خواب عدم چشم کشودیم“

دیدیم کہ باقی ست شبِ فتنہ غنویم“

داو جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ ”بیٹا یہ
شعر تو کئی مرتبہ سننا چکلی ہے۔“

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے۔ ”بھی آج تمہاری بے بے بھی ایک
شعر نائے گی۔“ مگر بے بے ایک ہی روکھا سا جواب دیتی۔ ”مجھے نہیں آتے شیر
کہت۔“ اس پر داؤ جی کہتے ”گھوڑیاں ہی نادے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا
دے۔“ اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرانہ سکتی اور داؤ جی
عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان بھی امی چند کا بھی میرانام
ٹائک دیتے، پھر کہتے۔ ”میں اپنے اس گولومولو کی شادی پر سرخ گپڑی باندھوں گا۔
برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامہ پر شہادت کے دستخط
کروں گا۔“ میں دستور کے مطابق شربا کرنے کا ہیں پنجی کر لیتا تو وہ کہتے۔ ”پتہ نہیں اس
ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔
ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزوں پکانی کیکھ لی
ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو توبیہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی
ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو ففر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس
کو خطاطی کی تعلیم دوں گا۔ پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔
میں تو اپنی بہو کو سکھاؤں گا۔ سن گولو! پھر میں تیرے ہی بیاس رہوں گا۔ میں اور میری
بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بقر مائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ
دیکھا کرے گا۔ ”پھر وہ سینے پر باتھ رکھ کر جھکتے خیلے خوب خیلے خوب کہتے۔ جان پر چرا
ایں قدر زحمت می کش۔ خوب۔ یادوارم۔ اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ
جی! چنانی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے۔ ایک
دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا کچے تھے تو ہولے سے مجھے
کہنے لگلے۔ ”جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت یہوی اور مجھے سعادت مند بہو
عطائی ہے، ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میری امی چند کو بھی دے گا۔ اس کے خیالات کچھ
مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیوا سنگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند
لاٹھی چلانا گناہ کھلینا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا، ہاں خدا نے بزرگ و برتر اس کو

ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔“

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ حض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات لٹکے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہو گا۔ میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن 12 جنوری کو بی بی کی برات سچ مجھ آگئی۔ جیجا جی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتاچکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا، اس پر وہ پورا اترتا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سعدی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنجمی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرا میج گیا۔ بے بے زار و قطار روی رہی ہے۔ امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں۔ ”آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں کپڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔“ جیجا جی کے باپ بولے۔ ”مشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے۔“ تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پڑالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھ سے سے کپڑ کراٹھیا اور کہا۔ ”یہ کیا ہوا بیٹھا۔ اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔“ بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھانے سکا۔ تیرے سامنے شمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کروے گی اور شاید بخوردار رام پرتاب بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا خجل سر تیرے سامنے خم ہے۔“ یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سعدی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”مشی جی آپ فکر نہ کریں، بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا۔“ داؤ جی اوہر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ”کریما تو پڑھ چکی ہے۔ گلستان بوستان بھی ختم کراچکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔“ اس پر وہ بہن کر

بولے۔ ”آپ بھی حد کرتے ہیں۔ ساری گلستان تو میں نے بھی نہیں پڑھی، جہاں عربی آتی تھی، آگے گزر جاتا تھا۔“

— داؤ جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹھ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند کے اور پھر میرے سر پر پھیر اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی۔ داؤ جی میرا ہمارے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔ ”لویہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا ہمارا بنا پھرتا ہے۔ او گلو۔ او مردم دیدہ۔ تختے کیا ہو گیا۔ جان پدر تو کیوں —؟“

اس پر ان کا گلارینڈ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتح میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤ جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ زرا زور سے نکل جاتی تو داؤ جی آگے بڑھ کر رتح کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔ ”لا حول پڑھو بیٹا، لا حoul پڑھو۔“ اور خود آنکھوں پر رکھ ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے، اُسی کا تھا۔ اس میں بیس پچس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یو نہیں شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤ جی کو ”پنڈتا جے رام جی کی“ کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤ جی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا کہ وہ پنڈت نہیں ہیں، معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا لیکن رانو نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی موچھے چبا کر کہتا۔ ”لے بھئی جس کے سر پر بودی (چیا) ہو، وہ پنڈت ہی ہوتا ہے۔“ چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جو بھی ہوتا اور گندی اور نخش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کر کہا۔ ”مورنی تو چلی گئی بابو! اب تو

اس گھر میں رہ کر کیا لے گا؟” میں چپ رہا تو اس نے جاگ والے دودھ میں ڈب پھیرتے ہوئے کہا۔ ”گھر میں گنگا بہتی تھی، سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں؟“ مجھے اس بات پر غصہ آگیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمدہ ہوا لیکن وہ چکرا کرتخت پر گرپڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ کو سارا واقعہ ناکر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور ابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشائی کے بعد اسے سخت تنبیہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤ جی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کرنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤ جی کے فاضل سر پر وہ چھٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی مگر وہ کہتے تھے۔ ”یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آنغوш میں میرا سر رکھ کے اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چکاتی تھی۔“ گوئیں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پکڑی اتارنے کی جست اتنی کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی مازمت کے بعد چھٹیوں پر گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا۔ ”شہر جا کر جوٹی تو نہیں کٹوادی؟“ میں نے لنگی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ ”تم سعادت مند بیٹا کم ماوں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم ساخوش قسم استاد بھی خال خال ہو گئے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو۔“ میں نے ان کے پاؤں ٹھپھو کر کہا۔ ”حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔“ ہنس کر فرمانے لگے۔ ”چنت رام ہمارے پاؤں نہ ٹھپھو کرو۔ بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔“ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے کہا۔ ”اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لیے دوائی نکال لاؤ۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی نانگوں کے لیے نذر کروں لیکن میرا بس نہیں چلتا۔“ خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ ”خدا کو یہی مظہور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے۔“ داؤ جی گزرے ایام کی تہہ میں اترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”میں صحیح سویرے حوالی کی ڈیوبڑی میں جا کر آواز دیتا۔ خادم آگیا۔“ مستورات ایک طرف ہو

جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوٹا اور حکم کا انتظار کرنے لگتا۔ وہ دعا دیتے، میرے والدین کی خیریت پوچھتے، گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے۔ ”لو بھتی چنت رام اب اس گناہوں کی کٹھڑی کو اٹھالو۔“ میں سبد گل کی طرح انہیں اٹھاتا اور کمر پر لا کر جویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ”ہمیں باغ کا چکر دو۔ کبھی حکم ہوتا سیدھے رہت کے پاس لے چلو اور کبھی کھمار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔“ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر نہیں مانے۔ یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے اور جب جی چاہتا ہے، تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں انہیں وضو کرانے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوڑے اتارتا اور انہیں جھوٹی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھست کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انہیں اس طرح جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس کے بعد جرأت نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اٹھاتا جب وہ میرانام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قبیہ کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر جویلی کو لوٹتا تو فرماتے ”ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لیے قبیہ کی سیر کرتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لد الدا پھرتا ہوں، دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں۔“ اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لد الدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہاہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لیے وقف کر دیا ہے۔

جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انہیں سنایا، اس قدر خوش ہوئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی ہو۔ دین و دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالا مال کیا۔ دست شفقت میرے سر پر پھیر اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام دیا۔ میں نے اسے جبراً سود جان کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر دعا میں دے رہے تھے اور فرمائے تھے۔ ”جو کام ہم سے نہ ہو سکا، وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے، خدا نے یہ سعادت تھے نصیب کی۔ چنت رام تیرا

موئی چوپاں کا پیشہ ہے تو شاہ بلطحا کا بیرون ہے۔ اس لیے خداۓ عز و جل تھے برکت دیتا ہے۔ وہ تھے اور بھی برکت دے گا۔ تھے اور کشاں میسر آئے گی۔“
داوجی یہ باتیں کرتے سر گھننوں پر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آ رہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انہوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرا کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے۔ شام کے وقت سکول پہنچنے کا انہوں نے وطیرہ بنالیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ ہاؤس کی راہ کھسک گیا تو انہوں نے جماعت کے کرے کے سامنے آ کر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بذریں بھی ہو گیا تھا۔ داؤ کے بچے گویا میرا تکیہ کلام بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو میں انہیں کہتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اسی قدر کہتے۔ ”دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جان پدر یہ تیرے بڑھے باپ کو کتا کہتا تھا۔“ میری گالیوں کے بد لے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انہیں زیادہ دکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انہیں غصہ آتا تھا، نہ دکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انہوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب، برخوردار آفتاب کہہ کر انہیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے جن میں گلو انہیں بہت مرغوب تھا۔ طبوہ ادویہ درجہ پر مسٹر ہونیق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دق کرتا، وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں۔ مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہاں کی ابجد کو ضرب دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کراؤ نچے اونچے گانے لگاتا۔

تیرے سامنے بیٹھ کے رواناتے دکھ تینوں نیوں دننا
داوجی جرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر

دیتا۔ نیوں نیوں دناتے دکھ تینوں نیوں دناتے دنادنادنادنادنہ۔ تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گامارونا رونا رونا سارے گامارونا روناتے دکھ تینوں نیوں دناتے دنادنادنادنادنہ۔ عینک کے اوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آ کر کاپی اٹھاتے۔ صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ ”سن بیٹا!“ وہ بڑی محبت سے کہتے۔ ”یہ کوئی مشکل سوال ہے!“ جو نبی وہ سوال سمجھانے کے لیے ہاتھ نیچے کرتے، میں پھر تالیاں بجانے لگتا۔ ”دیکھ پھر، میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟“ وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

”نہیں!“ میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

”تو اور کون ہے؟“ وہ ماں سے ہو جاتے۔

”وہ سچی سرکار۔“ میں انگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا۔ ”وہ سچی سرکار، وہ سب کاپلنے والا۔“ بول بکرے سب کا والی کون؟“ وہ میرے پاس سے اٹھ کر جانے لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا۔ ”داوَجی خفا ہو گئے کیا؟“ وہ مسکرانے لگتے۔ ”چھوڑ طبورے! چھوڑ بیٹا! میں تو پانی پینے جا رہا تھا۔ مجھے پانی تو پی آنے دے۔“ میں صحوث موث بُرا مان کر کہتا۔ ”لوگی جب مجھے سوال سمجھنا ہوا داؤ جی کو پانی یاد آگیا۔“

وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے۔ ”اخفشن اسکوارِ جب تھے چار ایکس کا مرینع نظر آرہا تھا تو نے تیرا فارمولہ کیوں نہ لگایا اور اگر ایسا نہ بھی کرتا تو۔“ اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤ جی کتنے دن تک پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرا ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا لیکن جیو میسری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤ جی نے بہت کوشش کی لیکن کچھ بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انہوں نے کہا۔ کل باون پر اپوزیشنیں ہیں، زبانی یاد کر کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انہیں رٹنے میں مصروف ہو گیا لیکن جو پر اپوزیشن رات کو یاد کرتا،

صح بھول جاتی۔ میں دلبرداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ سی بیٹھا۔ ایک رات داؤ جی مجھ سے جیو میسری کی شکلیں بنو کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی پکھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار انکا تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیرہ بجے تک لکھ لکھ کر رنا لگا تارہا مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد انک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آگیا اور میں باہر صحن میں آکر سیڑھیوں پر بیٹھ کے چمچ رو نے لگا۔ گھننوں پر سر رکھ کے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیرہ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لیے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لیے سرا و پر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے نیرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر پُنوم کر کہا۔ ”لے بھائی طبورے، میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔“ پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھ کیں لے لے گئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لیتی اور خود پاؤں اور پر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا۔ قلیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے۔ میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں، انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس میں الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ہر ہو گیا ہوں لیکن ایک رات میں اپنی کھات پر پڑا مقاوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھن گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہنسہ سے پایہ ثبوت کونہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کر تارہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھانا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی۔ وہیں حضرت مولانا کی طبع رسما کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمائے

لگے۔ ”چنت رام، اب ہم تم کو نہیں پڑھ سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔“ میں نے جرأت کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے متزادف سمجھتا لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شو شہ میرے لیے حکمِ رباني سے کم نہیں، اس لیے خاموش ہوں۔ بھلا آقائے غزنوی کے سامنے لیا زکی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دکھ بہت ہوا ہے۔ فرمائے لگے۔ ”تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو شُن لی ہوتی۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔ ”ارشاد۔“ فرمایا ”دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہند سہ کے بڑے ماہر ہیں۔ اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔“ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا۔ ”اپنی والدہ سے پوچھ لینا، اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا۔“ والدہ مرحومہ سے پوچھنا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پاننا انہوںی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی بیانی پتائی کر رہا ہوں۔ جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لا یغل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوان میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت نہ مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں۔ ایک رات جب سارا گاؤں سورہ تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پتاری سے اس کی کل پونچی سے دور و پے چرا لیے اور نصف اس کے لیے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حوالی کے پیچھے ان کے مند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا۔ بد قسم ہوں، بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاوں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر

رکھ کر میں وہاں سے چل دیا۔ سن رہا ہے؟“ داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خار پشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا۔

”جی؟“

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جا کھل جنید سرسہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دودن چلتا۔ اس طرح تائید غبی کے سہارے سولہ دن میں میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آئی تھی، لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا۔ جس کسی سے پوچھتا، حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے؟ نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاد رہتی، صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لیے نفی کو ٹھیکان بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں ٹھیک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو نیندہ یا بندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ پھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروش تھے اور چند دوستوں سے اوپنے اوپنے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ ”کون ہے؟“ میں نے سلام کر کے کہا۔ ”حکیم صاحب سے ملنا ہے۔“ حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہو لے۔ ”اسم گرامی؟“ میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”پنجاب سے آیا ہوں اور۔“ میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے ہو لے۔ ”اوہ! چنت رام ہو؟“ میں کچھ جواب نہ دے سکا۔ فرمائے لگے۔ ”مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے۔ لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے۔“ میں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔“ میں اسی طرح غاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں ہو لے۔ ”میاں اندر آ جاؤ، کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟“ میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور دیسے ہی عروس نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر

قدرتے تھکمانہ انداز میں کہا۔ ”برخوردار بیٹھ جاؤ۔“ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا۔ ”بھتی ذرا نٹھرو، مجھے اس سے دودو ہاتھ کر لینے دو۔“ پھر حکم ہوا۔ ” بتاؤ پہنسہ کا کون سامسلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ گرتے ہوئے اور پھر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنسہ ہو گئی۔ پھر فرمایا ”باتاوا اپنی انگلی سے میری کمر پر مقاوی الساقین۔“ مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا، نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی۔ نہ پچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ ”میاں جلدی کرو، ناپینا ہوں، کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔“ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتے ہوئے انگلی سے مقاوی الساقین بنانے لگا۔ جب وہ غیر مریٰ شکل بن چکی تو بولے۔ ”اب نقطہ س سے خط بچ پر عمود گراؤ۔“ ایک تو میں گھبرا یا ہوا تھا، دوسروے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یوں ہی انگل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے ”ہے ہے، کیا کرتے ہو۔ یہ نقطہ س ہے کیا؟“ پھر خود ہی بولے۔ ”آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ باہمیں کندھے سے کوئی چھ انگلی نیچے نقطہ س ہے۔ وہاں سے خط کھینچو۔“ اللہ اکبر اللہ اکبر۔ کیا علم تھا، کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مہبوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں مقاوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔ پھر داڑھی دلی کے دونوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ ”پھر کیا ہوا ادھی؟“ انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”رات بہت گزر چکی ہے، اب تو سو جا، پھر بتاؤں گا۔“ میں صدمی نیچے کی طرح ان کے پچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا۔ ”پہلے وعدہ کر کہ آئندہ ماہیوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پر اپوزیشنوں کو بتائے سمجھے گا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”خواں سمجھوں گا، آپ فکر نہ کریں۔“ انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”بس محقریہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بھر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔“ فرمائے لگے۔ ”چنت رام! اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ

لیں۔ ”اس پر میں رو دیا تو دستِ محبت میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے۔ ”ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقہ بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔“ یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ مجھے اسی طرح ٹم ٹم چھوڑ کر بیٹھ کے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میراخون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤ جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن مٹھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ ”اپ تازی بن طویلہ خرشنہ بن۔“ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجا جان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مرن برٹ نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آج گایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھیڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا، کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا، پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیتہ ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ ”ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی، ابھی طبوڑہ بڑیڑ رہا ہے۔“ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے۔ ”کوئی نسر نکال طبوڑے، کسی آہنگ پر نج، یہ کیا کر رہا ہے؟“ جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی تباخ ہوانے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گزر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آئیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھیہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مر نے والوں کی رو حیں اس میلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا لیکچہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلک اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔ کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھیہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی

حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا، اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح سکنکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے۔ دوسرے میری پتلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تھیہ پر جا کر داؤ جی کو سوئے ہوئے کو اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں۔ غصہ سے بھرا اور دہشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤ جی تھیہ کی ٹھیکریوں پر گھننوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سرمار ہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گار ہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقالِ شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اور اٹھا کر انگشت شہادت فضامیں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہوا اور اس سے کہہ رہے ہوں، دیکھ لو، سوچ لو۔ میں تمہیں۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ سارا ہوں۔ ایک دھمکی دیئے جاتے تھے۔ پھر ترپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر سکنکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسی اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، بالصور و الاجتنان تھا۔ جب داؤ جی کا طلسہ اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چخ رہے تھے۔ جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد داؤ جی آئے۔ انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنایا کہا۔ ”چل طنورے“ اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لفکتی ہوئی سکھی پیڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور مجھومِ جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لمے لمے وال فریدا ٹریا ٹریا جا!

اس جادو گر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی انہیں دیکھا

کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا۔ اس کی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولے لگیں اور اس کا سارا وجود جنادھاری ہو گیا۔ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا، میں ان کے ساتھ سیر کونہ گیا۔

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے مکڑے آکر گرنے لگے۔ بے بنے آسمان سر پر اٹھالیا۔ بچتوں والی کتیا کی طرح داؤ جی سے چھٹ گئی۔ بچ جمع ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھیں۔ ”بڑھے ٹوکنگی! یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو والٹا ہمارے سر پر آگیا ہے۔ تیرے پر یہ میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں، اجائز مانگتے ہیں، موت چاہتے ہیں۔“ پھر وہ زور سے چھینٹ گئی۔ ”میں مر گئی، میں جل گئی لوگو۔ اس بڑھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا پربندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے۔ میرا انگ انگ توڑ دیا ہے۔“ امی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا دہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن چتو کی خشت باری انہیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھٹک کر کہا۔ ”تو حمق ہے اور تیری بے بے اُنم الجاہلین۔ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس۔ صد افسوس“ بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا۔ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آرہا تھا تو راستے میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کافی کر کے پوچھا۔ ”سنابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلنا تو نہیں لگا؟ سناء ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔“ میں نے اس کمینے کے منہ لگانا پسند نہ کیا اور چیپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیو میسری کی پر اپوزیشن میں سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ ”بیٹا کیا تم بچ جمع جن بھوت یا پری ڈھیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟“ میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے۔ ”واقعی تو بہت بھولا ہے۔ میں نے آج خوا مخوا تجھے جھٹک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح اینٹیں پھینک سکتے ہیں۔ ہم

نے جو ولی مسٹری اور پھنتے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے، وہ تیرے کسی جتن کو کہہ کر بنوالتے لیکن یہ بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنانی بھی جانتے ہیں؟“ میں نے جل کر کہا۔ ”جتنے مذاق چاہو کرو مگر جس دن سر پھٹے گا، اس دن پتہ چلے گا داؤ۔“ داؤ جی نے کہا۔ ”تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تاقیامت سر نہیں پھٹ سکتا، اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ انھائی جاسکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔“

پھر بولے۔ ”شُن! علم طبی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جاسکتی۔ سمجھ گیا؟“
”سمجھ گیا؟“ میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا لیکن میڑک کے امتحان کا سائز رہ تھا۔ امتحان دینے کے لیے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صحیح آگئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لیے ضلع جاری تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ایک ہجوم تھا اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچپے رہ سکتے تھے اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاوں سے نواز رہتے تھے اور داؤ جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہتے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اُپھل کر موم کے تنفس و تبدل پر پہنچ جاتے۔ وہاں سے پلتے تو ”اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں پُنور تھا۔ ایک عورت—“

”جہا نگیر۔“ میں نے جواب دیا۔ ”اور وہ عورت؟“ ”نور جہا۔“ ”ہم دونوں ایک ساتھ بولے۔“ ”صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟“ میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے ”مثالیں؟“ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آگئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان ٹوکو فقردوں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موڑ شارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ ساتھ قدم انھا کر بولے۔ ”طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی۔ مادیاں گھوڑی۔ ماکیاں۔ مرغی۔ ایک سال بعد خدا

خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔“

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرا دن جغرافیہ کا اس سے بڑھ کر۔ تیسرا دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صحیح داؤ جی کا کئی صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ کوئی اور بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جو نہیں میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا، داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ بار کر کر ان سے لپٹ گیا اور ”اسی نمبر! اسی نمبر“ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تینی سے پوچھا۔ ”کون سا سوال غلط ہو گیا؟“ میں نے جھوم کر کہا۔ ”چار دیواری والا۔“ جھلا کر بولے۔ ”تونے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہیں کیے ہوں گے۔“ میں نے ان کی کمر پر ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں جی ہاں جی۔— گولی مارو کھڑکیوں کو۔“ داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے۔ ”تونے مجھے بر باد کر دیا طنبورے۔ سال کے تین سو پنیسھے دن میں پکار پکار کر کھتار ہا۔ مسطحات کا سوال آنکھیں کھوں کر حل کرنا مگر تونے میری بات نہ مانی۔ تونے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے۔— پورے بیس نمبر۔“ اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کا میابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے پوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے۔ ”اگر متحمن اچھے دل کا ہوا تو وہ ایک نمبر ضرور دے گا۔ تیراباتی حل تو ٹھیک ہے۔“ اس پرچے کے بعد داؤ جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے بیہاں چلتے جاتے۔ صحیح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔ امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤ جی کو یوں چھوڑ دیا گویا۔ میری ان سے جان پیچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا

کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤ جی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مُصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کانج کی پڑھائی کے لیے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کانج میں سوار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤ جی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑ دیئے، ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا، انہوں نے کہا، اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا، فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی، میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤ جی پوچھ رہے ہیں Cow ناؤں ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندر ھلپا نچویں جماعت تک پڑھا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤ جی فرمار ہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ ۵۰ Cow کا مطلب ہے ڈرانا، ہمکی دینا اور یہ ان دونوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھلنے کے لیے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی سے آگے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤ جی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر رسمًا ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤ جی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے ”افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔“ میں شرارتا خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور ابا جی لڑاؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤ جی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اندر سے کرسی اٹھالائے اور اپنے بوریے کے پاس ڈال کر بولے۔ ”ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقصوم کی خوبی سمجھتے۔ میرا خیال تھا کہ اس کی فرست ڈویشن آجائے گی لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی۔“

”ایک ہی تو نمبر کم ہے۔“ میں نے چیک کر بات کائی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ ”تو نہیں جانتا، اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے مجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔“